# اقبال کا تصورِ نظام عدل: ایک مطالعہ

**ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی**

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، یونیورسٹی آف کشمیر

علامہ اقبال (۱۹۳۸ء۔۱۸۷۷ء) نے اس دور پر آشوب میں شعور کی آنکھ کھولی جب نہ صرف پورا برصغیر بلکہ نصف سے زیادہ دنیا میں انگریز استعمار کی تہذیبی، تمدنی اور فکری یلغار شدّت سے جاری تھی۔ اُس وقت پورا برصغیر برطانوی استعمار کا براہ راست غلام تھا۔ نہ صرف برصغیر بلکہ تمام مشرق پر اس کی گرفت مضبوطی سے قائم تھی اور اس کی حریصانہ نظریں تمام عالم پر جمی ہوئی تھیں۔ دراصل یہ سب نتیجہ تھا مسلم اقوام کے داخلی انتشار، آپسی سر پھٹول، بے حسی اور سہل پسندی کا۔ مسلم اقوام آج کی طرح اُس وقت بھی خود اپنے ملی اتحاد کے شعور کو مجروح کرنے پر تلی ہوئی تھیں اس لیے قومی تعصب، لسانی منافرت اور مسلکی اختلافات آج کی طرح ملت اسلامیہ کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر رہے تھے۔ وطنیت کا تصور عام تھا اور دینداری میں فقط ظاہرداری کے رویے کو فروغ حاصل تھا۔ پورا عالم اسلام گویا عالم پیری سے گزر رہا تھا۔

علامہ اقبال جیسے متبحر دانشور اور متحرک وجود رکھنے والے ملت اسلامیہ کے غمخوار یہ سب کچھ اپنی رگِ جاں میں محسوس کر کے تڑپ رہے تھے کیونکہ مغربی تہذیب وتمدن کے اثرات، نتائج اور اُن کے جارح عزائم سے آپ پوری طرح آگاہ تھے۔ اس سیلاب بہ تمیزی کا انھیں شعوری ادراک حاصل ہو چکا تھا اس لیے اس آگ میں جل کر اس کی اذیت ناکیوں کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہوئے وہ چیخ اٹھے:

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ

لہٰذا علامہ نے ایک مضبوط لائحۂ عمل کے تحت تہذیب مغرب پر بھرپور انداز سے علمی انتقاد کا فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے مغرب زدہ مسلماں اقوام کو مغربی استعمار سے نکلنے کا شعور سکھایا کیونکہ مشرق میں اسی فرنگی تہذیبی جارحیت کی وجہ سے الحاد اور لادینیت کے اثرات نے مشرق کا وقار بُری طرح پامال کیا تھا۔ علامہ اقبال نے اس ساری صورت حال کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کر کے پہلے مرض کی تشخیص کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ قُرونِ وسطیٰ کا تصوف (Medieval Mysticism) حال کا ملحدانہ سوشلزم اور قومی ونسلی امتیازات زبُوں حال اور پراگندہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا کسی بھی طور نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جہاں اپنی پیامی شاعری میں پیرایہ بدل بدل کر تمام عالم انسانیت کو اس کرب سے نجات دلانے کی کوششیں جاری رکھیں وہاں اپنی اعلیٰ انگریزی نثری فلسفیانہ تصنیف فکری اسلامی کی تشکیل جدید یعنی "The Reconstruction of Religious thought in Islam" میں واشگاف انداز سے مغربی استعمار کو یہ علمی چیلنج پیش کیا:

> "Neither the technique of medieval mysticism nor nationalism nor atheistic Socialism can cure the ills of a despairing humanity. Surely the present moment is one of great crisis in the history of modern culture . The modern world stands in need of biological renewal and religion, which in its higher manifestation is neither dogma, nor priest hood, nor ritual, can alone ethically prepare the modern man for the burden of great responsibility which the advancement of modern science necessarily involves, and restores to him that attitude of faith which makes him capable of winning a personality here and retaining it hereafte."

اقبال کے درج بالا انگریزی اقتباس سے یہی حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ انسانوں کے تمام سیاسی، اقتصادی، سماجی، اخلاقی اور ذہنی امراض کا مداوا مذہب ہی سے ہوسکتا ہے۔ اِنسانوں کے اندر اُمید، احترام اور باہمی ہمدردی کے جذبات بیدار کرنے کے لیے مذہب بے حد اہم ہے۔ خودی یا خودداری کی تعمیر وتکمیل اور اجتماعی بہتری کا خواب مذہبی بیداری کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا کیونکہ اپنی گوناگوں ذمہ داریوں سے احسن طریقے سے ہم عہدہ برآ تب ہی ہو سکتے ہیں جب ہم دنیا کو راحت کدہ بنانے کی

خاطر اپنے من میں ڈوب کر پہلے اپنا احتساب نفس کریں۔ جب تک ہم اپنے باطن کو نہیں سنواریں گے اُس وقت تک ہم اپنے دامن کو مسرت اور سکون سے قطعاً نہیں بھر سکیں گے۔ یہ اقبال کا پیغام تھا اُس وقت کی استعماری قوتوں کے لیے، جنھوں نے اپنے نشے میں چور ہوکر ساری دنیا کو یرغمال بنا کے رکھا تھا۔

درحقیقت اقبال کو مسلم مفکرین میں اس لحاظ سے نہایت ممتاز مقام حاصل ہے کہ انھیں بیسویں صدی کے آغاز سے ہی مغربی تہذیبی اور سیاسی خلفشار اور استعماری رویے کا تنقیدی جائزہ لینے کا نہ صرف موقع ملا بلکہ اس میں انھیں ایسے محرکات نظر آئے جو ایک طرف اقوام مشرق کے لئے تباہ کن تھے تو دوسری جانب خود مغربی تہذیب وتمدن کی تباہی کی طرف بھی واضح اشارات دیتے تھے۔ اس حقیقت کا ادراک بھی اقبال کو اپنے پہلے سفر یورپ کے دوران ہی ہو گیا تھا۔ اپنے آخری سفر یورپ کے زمانے اور وفات تک انھیں مغرب کے استحصال، مادّی ہوس، نام ونمود اور حُبِ جاہ کے نتائج کا مشاہدہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ مغرب کی اس پراگندہ معاشرت کو دیکھ کر انھوں نے اُسی دور میں انھیں للکار کر یہ پیش گوئی کی:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اقبال کو اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد یورپ سے واپس آئے ہوئے ابھی سات سال سے بھی کم عرصہ گزرا تھا کہ مغربی تہذیب وتمدن کا خود اپنے ہاتھوں سے خودکشی کرنے کا عمل شروع ہو گیا یعنی ۱۹۱۴ء میں یورپی اقوام کے مابین جنگ عظیم اوّل چھڑ گئی۔ اُن کے عمیق مطالعہ کے مطابق اس جنگ کی بنیادی وجوہات خود مغربی معاشرہ اور تمدن کے خمیر میں دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک اُس کی ایک بہت بڑی وجہ حکومت اور مذہب کی جُدائی کا تصور ہے۔ اسی وجہ سے ہوس پرستی اور مطلق العنانیت میں یورپ اس حد تک شرابور ہوا کہ اس نظام حیات میں روحِ اخلاق سرے سے ہی مفقود ہوگئی اور اس کا رُخ دہریانہ مادّیت کی طرف مڑ گیا اور اقبال نے اس تصور دین و دنیا کی جُدائی پر یوں اظہار کیا:

ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کی اسیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

بہر کیف علامہ اقبال اپنے عمیق تاریخی مطالعہ اور تہذیبی شعور کی بدولت بالآخر اس نتیجے پر پہنچ چکے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کا یورپ نہ صرف کسی نئے جاندار عالمی نظام حیات کو جنم دینے کی صلاحیت رکھنے سے محروم ہو چکا ہے بلکہ خود اس کی اپنی اجتماعی قدروں Values کا داخلی انتشار اسی حقیقت کی غمازی کر رہا تھا کہ یہ خودساختہ انسانی نظام بھی عنقریب درہم برہم ہو کر رہے گا۔ اقبال بچشم خود اس حقیقت کا اُس وقت بھی یہ مشاہدہ کر رہے تھے کہ اسی نظامِ دہریت کی وجہ سے فرد اور معاشرہ دونوں شدید ذہنی پراگندی اور مایوسی کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس لیے اُن کے نزدیک اس وقت دنیا کو حیاتیاتی اعتبار سے زندہ ہونے کی ضرورت ہے، لیکن یورپ کا نظام حیات جو خود شکست خوردگی کا شکار ہے، دنیا کو دوبارہ زندہ کرنے کی سکت اور صلاحیت سے بالکل قاصر ہے۔ اسی لئے انھوں نے یورپ کی پہلی عالمگیر جنگ کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ایک اہم تقریر میں یہ انکشاف کیا تھا:

''میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق پیشین گوئیاں کی تھیں۔ اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے۔ اس سے چھ سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری یہ پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔'' علامہ اقبال کے دور حیات میں ہی اقوام مغرب نے جمعیت اقوام کی داغ بیل ڈالی اور اسے اس طرح تشکیل دیا کہ اس میں بظاہر اقوام مشرق کو بھی نمائندگی دی گئی مگر جہاں تک اس بین الاقوامی ادارے کے مقاصد کا تعلق تھا، یہ ظاہراً تو غیر جانبدار (Impartial) طریقے پر امن عالم اور اتحاد و عالم انسانیت اور عام انصاف کی دہائی دینے والا ادارہ تو تھا لیکن اس بظاہر غیر جانبدارانہ انداز میں مغربی اقوام نے ایشیائی و افریقی اور بعض یورپی غریب قوموں کے ساتھ امتیازی اور ظالمانہ رویے جاری رکھے۔ انھوں نے اس کے ضمیر کو بیدار ہونے نہیں دیا حالانکہ ان قوموں نے بظاہر تخفیف اسلحہ کی قراردادیں تک منظور کیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے لیے اسلحہ کے انبار بھی لگا دیے۔ علامہ اقبال نے اُسی دور میں بھانپ لیا کہ یہ جمعیت دراصل ایمان و یقین کی دولت سے عاری ہے اور اس کی اساس سراسر مادیت، خودغرضی اور مطلق العنانیت کے مکروہ عزائم پر رکھی گئی ہے اس لیے کامیابی اس کے نصیب میں ہرگز نہیں۔ لہٰذا انھوں نے مشرق کو اس کے ان جارح عزائم سے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ مغربی عظیم طاقتوں کا یہ اتحاد صرف اور صرف کمزور قوموں کی تباہی اور اُن کی بندر بانٹ چاہتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اسی لیے ''پیام مشرق'' میں استعماری قوتوں کے

بنائے ہوئے اس نام نہاد عالمی اتحادی فورم یا لیگ آف نیشنز فتنہ گروں اور کفن چوروں کی جماعت قرار دیتے ہوئے کہا:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

یعنی میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ چند کفن چوروں نے مل کر ہمیں مردوں کے کفن اتار کر بیچنے کی غرض سے قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنائی ہے یعنی ان افریقی اور ایشیائی قوموں کا خون پینے والی طاقتور یورپی قوموں نے ان کی رہی سہی دولت اور غیرت کو لوٹنے کے لیے اقوام متحدہ یا جمعیت الاقوام کی خیر خواہی کا لبادہ اوڑھا ہے۔ علامہ اقبال مسلم حکمرانوں کو بیدار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھیں اس مغربی استعماری حربے کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیے اور اس کا نعم البدل وہ یوں دیتے ہیں کہ مسلم اقوام کو مشرق کی ایک الگ جمعیت ہونی چاہئے جس کے لیے وہ بطور مرکز تہران کا نام تجویز کرتے ہیں۔ گویا علامہ نے آج سے تقریباً نوے سال قبل جو یہ پیشین گوئی کی تھی:

تہران ہوگر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کُرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

تو یہ حرف بحرف آج بھی معنیٰ خیز ثابت ہو رہی ہے کیونکہ جب ہم اس اعتبار سے دور حاضر کے ایک بڑے مغربی استعمار امریکہ کے موجودہ عالمی کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ نہ صرف عالمی جارح کا کردار اپنا رہا ہے بلکہ وہ تمام دنیا کی تباہی اور بربادی کے سامان بھی اپنے حلیفوں کو عطا کر رہا ہے۔ دور جدید کی سائنسی اور علمی پیش رفت کے مطابق امریکہ کا متوقع کردار یہ تھا کہ وہ اپنی مستحکم بین الاقوامی ساکھ کی بدولت اخوت، حریت اور مساوات جیسے اعلیٰ اصولوں کی حکمرانی اور بالادستی قائم کرنے کے لیے دنیا کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا لیکن اس کا موجودہ کردار نہ صرف ان اصولوں کی بیخ کنی کرنے کا منہ بولتا ثبوت ہے بلکہ وہ خود غرض، لوٹ کھسوٹ اور امیر و غریب میں تمیز روا رکھنے والے جیسے قبیح امتیازات میں مبتلا ہو کر عالم دنیا میں عدل و انصاف کی دھجیاں بکھیر رہا ہے اور اس طرح طاقت کے نشے میں چور ہو کر وہ افغانستان، پاکستان اور عراق میں بے گناہ انسانوں کا قلع قمع کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اور اب اپنے جارح عزائم تمام عرب دنیا تک پھیلانے میں مصروف عمل ہے۔ ان حالات میں صرف ایران پر اُس کی گرفت ابھی مکمل طور پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہے۔ شاید اسی ایرانی قوم کی غیرت کو دیکھ کر علامہ اقبال نے مسلم اُمہ کو اُس وقت تہران کو اپنا مرکز قرار دینے کی تجویز پیش کی تھی۔

دراصل عصر حاضر میں امریکہ اپنے قومی فلسفہ کی بنیاد پر تمام دنیا میں اپنا نظامِ حیات نافذ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوگا، اس کا فیصلہ آنے والے ایام میں ہوگا لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جو فلسفہ امریکہ میں کسی مستحکم تہذیب، ثقافت یا سیاست کو پروان نہیں چڑھا سکا وہ دنیا کو کیا ثقافت یا تہذیب دے سکے گا۔

امریکہ یا کسی اور استعماری قوّت کو اگر واقعی امن، سلامتی، عدل و انصاف اور انسانی بھائی چارے کی بنیاد پر کوئی نیا نظام حیات متعارف کرانا ہے تو اُسے اپنی بین الاقوامی حکمت عملی کا رشتہ یقیناً علامہ اقبال کے اسلامی تصورات پر مبنی اصولوں سے جوڑنا ہوگا جس میں عالم انسانیت کے لیے امن راحت اور اطمینان کے تمام عناصر موجود ہیں، لیکن بدقسمتی سے اسلام اور مسلمانوں کو یہ قوتیں بنیاد پرستی کا طعنہ دے رہی ہیں حالانکہ مسلم امہ میں اس بنیاد پرستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس بنیاد پرستی کی یہ توضیح کر رہے ہیں۔ موجودہ امریکی اور دیگر استعماری قوتوں کی جارحانہ پالیسی کے بارے میں اقبال کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں:

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کِشتِ دہقاں، تم نے لُوٹے تخت و تاج
پردہ تہذیب میں غارت گری، آدم کُشی
کل رَوا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج!

علامہ اقبال مذکورہ بالا استعماری نظام کے مقابلے میں اسلام کا عادلانہ نظام حیات کا تصور پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ نظام اُن اُولوالعزم افراد کے ہاتھوں پروان چڑھ سکتا ہے جو اعلیٰ اسلامی سیرت و کردار سے مزین ہونے کے علاوہ علم و بصیرت میں یکتائے روزگار ہوں گے۔ علامہ کے مطابق جو ملت اُن شرائط کو پورا کر دے جو اس شعر میں بیان ہوئی ہیں وہی اس نظامِ عدل و انصاف کو نافذ کرنے میں کامیاب ہوگی یعنی:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال دنیا بھر میں احترام انسانیت کی بحالی کے ساتھ ساتھ عدل و انصاف کی سربلندی کے آرزومند ہیں۔ احترامِ آدمیت اور عدل و انصاف کی اعلیٰ روایات کو بحال کرنے سے ہی دنیا بھر میں امن و سلامتی کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اقبال آزادیٔ فکر و عمل اور حریتِ دین کے ہمیشہ علمبردار رہے۔ وہ قوم پرستی اور مذہبی منافرت کے سخت مخالف ہیں۔ وہ دراصل حقیقی طور پر بنی نوع انسان کی وحدت کے علمبردار ہیں۔ چنانچہ

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو سے اپنی ایک تاریخی تقریر میں عالم انسانیت سے آپ یوں مخاطب ہوئے۔ ''وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ ہے بنی نوع انسان کی وحدت جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت' اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللّٰہ کے اصول کا قائل نہ ہوگا۔ اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے'' درحقیقت علامہ اقبال خود بھی اس دنیا کی ایک بہت بڑی علمی قوّت تھے۔ آپ نے اپنی تمام ادبی اور علمی صلاحیتوں کو احترام انسانیت کی سربلندی کی خاطر وقف رکھی۔ اُن کا یہ شعر انہی جذبات کی عکاسی کرتا ہے:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

اُن کے نزدیک جدید نظام حیات کی تشکیل کے لیے انسانیت کو آج تین اوصاف کی اشد ضرورت ہے اس سلسلے میں وہ "Reconstruction" میں بیمار اور پراگندہ انسانی ذہن کے لئے یہ بہترین نسخہ تجویز کرتے ہیں:

"Humanity needs three things today-a spiritual interpretation of the Universe spiritual emencipation of the individual, and basic principles of a Universal import directing the evolution of human society on a spiritual basis."

یعنی اول کائنات کی روحانی تعبیر دوم فرد کا روحانی استخلاص یعنی ہر قسم کے جبر اور توہم پرستی سے نجات اور سوم وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقا روحانی اساس پر ہو سکے۔

اگر چہ یہ تینوں اصول اساسی طور پر اسلامی نظام فکر میں موجود ہیں تاہم علامہ نے جدید ذہن کو براہ راست اس طرح متوجہ نہیں کرایا بلکہ مغربی فلسفہ دانوں جیسے آئن سٹائن اور برگساں کے نظریات پر غور و فکر کا مشورہ دینے کے بعد دیا تا کہ بلاتعصب مشترکہ انسانی مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔ کائنات کی روحانی تعبیر کے علاوہ علامہ اقبال جدید عالمی نظام کی نشو ونما کے لیے ایک ایسے معاشرے کے قیام کے آرزومند ہیں جہاں ہر فرد جبر، ظلم، استحصال اور توہم پرستی کے تمام ہتھکنڈوں سے آزاد ہو کر اپنے ضمیر کی آواز پر تسخیر کائنات کے ساتھ ساتھ اپنے دینی مشاہدات کی روشنی میں روحانی زندگی کی تکمیل کے عمل میں مصروف عمل رہے۔ اسی تصور حیات کے عملانے سے دنیا میں انسان دوستی، عدل و انصاف اور احتساب نفس کا انقلاب بپا ہوگا۔

محاکمہ : مذکورہ بحث و تمحیص کے آئینے میں جب ہم فکر اقبال کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو یہی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اقبال نے عمر بھر اپنے تصورِ فکر کی بنیاد پر اپنے علم و بصیرت کے ذریعے جو فکری انقلاب بپا کیا۔ یہ دراصل اس کی کرشمہ سازی ہی ہے کہ آج نہ صرف عالم اسلام ہی میں بلکہ پورے کرۂ ارض پر احیائے اسلامی کے چرچے ہیں۔ یورپ اور امریکہ تک کے بعض دانشور سنجیدگی سے غور و فکر کر رہے ہیں کہ ایشیا اور امریکہ کے مسلمانوں کو صدیوں تک اپنے استعمار و استبداد کی گرفت میں اسیر رکھنے کے باوجود اسلام کا جذبہ اُن کے دلوں اور دماغوں میں زوال پذیر نہ ہو سکا۔ یہ چاروں طرف سے اسلام کے حرکی (Dynamic) نظام کے بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک سی کیوں سنائی دے رہی ہے۔ یہ راز معلوم کرنے کے لیے قرآن و حدیث، اسلامی فقہ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا از سر نو بیدار ذہنیت کے ساتھ مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ ایک زمانے میں تو ایک سامراجی قائد نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے ایک ایسا نظام تعلیم ترتیب دیا ہے جو مسلمانوں کے اسلامی تشخص (Identity) اور امتیاز کو ختم کر دے گا اور مسلمانوں کی ایسی نسل تیار کرے گا جس کی شکل و صورت مسلمانوں جیسی ہوگی (جیسا کہ علامہ کے دور میں کچھ نام نہاد مسلم مفکرین گزرے ہیں) لیکن فکر غیر اسلامی ہوگی۔ وہ اپنے مظاہر میں تو آزاد ہوں گے لیکن فکری اور ذہنی اعتبار سے وہ مغرب کے غلام ہوں گے مگر یہ اسلامی نظامِ حیات کی کرشمہ سازی ہی ہے اور عصر حاضر میں اقبال جیسے مفکر ملّت اور مجدّد اعظم کی انتھک فکری کوششوں کا ثمرہ ہے کہ معاملہ اب اس کے برعکس ہے۔ اب تو موجودہ مسلمان نسل بظاہر مغرب زدہ نظر آتی ہے، لیکن اس کا دل اسلامی نظام حیات کی محبت سے سرشار اور اس کا دماغ اسلامی افکار و نظریات سے منوّر رہے۔ آج ہم بچشم خود یورپی اور امریکی ممالک میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہاں جگہ جگہ مساجد، اسلامک سینٹر اور اسلامی تحقیقاتی مراکز قائم ہو رہے ہیں۔ اب تو وہاں ہزاروں، لاکھوں افراد اسلام کے اجتہادی نظام فکر و عمل سے متاثر ہو رہے ہیں۔ الحاد بے یقینی اور لامذہبیت کی دُھند اُن کے دل و دماغ سے کافور ہوتی جا رہی ہے۔ یہی اسلام کی عالمگیریت کے واضح امکان کا ایک بلیغ اشارہ ہے اور علامہ اقبال نے ہمیں اسلام کے اسی روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے ہوئے یقین دلایا ہے:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں مرے رازداں اور بھی ہیں

○○